© rasailojaraid.com

تعارفِ کُتب

INDIA WINS FREEDOM

(انگریزی) ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے

از مولانا آزاد مرحوم و مغفور

دنیا کی بزم آرائی بلاشبہ کسی فرد یا چند افراد سے وابستہ نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی رہینِ منت ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس بزم کے مختلف شرکاء کے کردار ایک جیسے نہیں ہوتے اور اہمیت کے اعتبار سے ان کے درمیان بڑی آسانی کے ساتھ ایک واضح خطِ امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔

اس کرۂ ارضی پر ایک بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو زندگی کے ڈرامے میں محض شمولیت کو ہی اپنا کمال سمجھتے ہیں، ان کا کام اتنا عام اور بندھا ٹکا ہوتا ہے کہ انسان اس میں کوئی کشش یا جاذبیت نہیں پاتا۔ اس لیے نہ تو کوئی آنکھ اُن کی طرف اُٹھتی ہے اور نہ ہی کوئی دل اُن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں اور اپنی ذاتی آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے گھوم پھر کر زندگی کی سرحد کو عبور کر جاتے ہیں۔ وہ قافلہ انسانیت کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ ان لاتعداد افراد کے برعکس کبھی کبھی انسانیت کی سطح پر ایسی شخصیتیں بھی نمودار ہوتی ہیں جنہیں بھیڑ میں چلنا گوارہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے لیے الگ راستہ بنانے کی جدوجہد کرتی ہیں۔ وہ انسانیت سے کچھ لیتی نہیں بلکہ اُسے اپنے فکر و عمل سے مالا مال کرتی ہیں۔ انہیں چند خوش نصیب لوگوں میں ایک ذات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی بھی ہے۔ مولانا کے طرزِ فکر سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے اُن کی سیاسی روش پر بھی ایک شخص گرفت کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا انسانیت کی ایک نہایت قیمتی متاع تھے۔ اُن کا اپنے مقصد کے ساتھ عشق، ان کی ذہانت و فطانت، اُن کی شعلہ بیانی، ان کا تبحرِ علمی، ان کی حق گوئی و بیباکی، اُن کا ایثار اور عزم یہ ایسی قابلِ قدر صفات ہیں جو ہر شخص سے خراجِ عقیدت حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہتی ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں ایک عرصہ دراز سے یہ خواہش تھی کہ وہ اس یگانۂ روزگار انسان کے ذہنی تاثرات اور قلبی واردات کو بغیر کسی واسطہ کے معلوم کریں۔

ان کی شخصیت کی کچھ جھلکیاں تو ان کی ساری تصنیفات میں مل سکتی ہیں۔ تذکرہ اور غبارِ خاطر اس معاملے میں سب سے نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے قریبی دوستوں اور عقیدتمندوں نے بھی ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر سے پردے اٹھائے ہیں لیکن ان سب کی موجودگی کے ہوتے ہوئے بھی ہر انسان اس بات کا آرزومند تھا کہ اُن کی ذات کا کوئی ایسا مرقع ہاتھ آئے جو انہوں نے اپنے قلم سے تیار کیا ہو۔ یہی وہ احساس تھا جس نے مسٹر ہمایوں کبیر کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مولانا کو اپنی سوانح حیات لکھنے پر آمادہ کریں۔ مولانا پہلے تو اس بات پر راضی نہ ہوئے لیکن جب اس کا بار بار تقاضا کیا گیا اور انہیں اس بات کا یقین دلایا گیا کہ اس کتاب کے لکھنے کی زحمت انہیں اٹھانا نہیں پڑے گی تو وہ تیار ہو گئے۔

زیرِ نظر کتاب ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے گو مولانا کی پوری داستانِ حیات نہیں لیکن یہ اُن کی زندگی کے ایک نہایت اہم دور کی قیمتی دستاویز ضرور ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں کون کون سے لوگ کس حیثیت سے شریک ہوئے۔ اُن میں کونسی خوبیاں اور خامیاں تھیں اور کس طرح بسا اوقات ذرا سی غلطی نے حالات کا رُخ بالکل ایک دوسری سمت میں پھیر دیا۔

کتاب کے پہلے باب میں مولانا نے اپنے خاندانی حالات اور اپنی ابتدائی زندگی کو بیان فرمایا ہے۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے دو برس بعد ان کے والد محترم کلکتہ تشریف لے آئے۔ مولانا نے اپنی ساری تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو سرسید کی تحریروں سے متعارف ہو گئے اور ان کے مطالعہ کے بعد انہیں اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ دورِ حاضر میں کوئی شخص اس وقت تک صحیح معنوں میں اہلِ علم نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ جدید سائنس، فلسفہ اور ادب سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی پڑھنی شروع کی اور اس کو سیکھ لینے کے بعد تاریخ و فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔

ان مغربی علوم نے اُن کے قلب اور دماغ کو شدید طور پر متاثر کیا اور اُن کے ذہن میں اُن معتقدات کے بارے میں عجیب و غریب شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہوئے جن سے وہ اوائل عمر میں آشنا ہوئے تھے۔ اپنی اس ذہنی کیفیت کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :

"میرا یہ دور ایک زبردست ذہنی بحران کا دور تھا۔ میں نے ایک ایسے خاندان میں جنم لیا اور ایک ایسے ماحول کی آغوش میں پرورش پائی جو مذہبی روایات کا بڑی سختی کے ساتھ پابند تھا۔ روایتی زندگی کے سارے ضوابط بلا چون و چرا قبول کرنے پڑتے تھے اور اہل خاندان پرانے طور طریقوں سے سرِ مو انحراف کو بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن ان مروجہ رسومات اور عقائد کو قبول کرنے پر میرا دل کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ اسی لیے میرے اندر ایک بغاوت کا جذبہ نمودار ہوا۔ وہ خیالات جو میں نے اپنے خاندان والوں سے اور ابتدائی تعلیم سے حاصل کیے تھے وہ اب میرے لیے موجبِ اطمینان نہ تھے۔ میرے اندر بالکل غیر شعوری طور پر یہ احساس اُبھرنے لگا کہ مجھے خود حق کی تلاش کرنی چاہیے۔ اس لیے بالکل غیر ارادی طور پر میں اپنے خاندانی اثر سے آزاد ہوتا چلا گیا اور اپنی ایک الگ دنیا آباد کرنے کا فیصلہ کیا۔ "آزاد" کا لفظ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔"

قریب قریب سترہ سال کی عمر میں مولانا نے سیاست کے خارزاروں میں قدم رکھا۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ مسلمان اپنے اصل مقصد کو بھول چکا ہے اور خوابِ غفلت میں مدہوش پڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا۔ الہلال اخبار نہ تھا بلکہ رعد تھا جس کی کڑک نے ہندوستان کی پوری زمین ہلا دی۔ اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دو سال کے عرصہ میں اس کی اشاعت ۲۶ ہزار تک جا پہنچی۔ جو لوگ سر سید کے طرزِ خیال کے حامی تھے۔ انہوں نے مولانا کے افکار و نظریات کی مخالفت کرنا چاہی لیکن انہیں اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاملہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو حکومت نے اس مجلہ کو ضبط کر لیا۔ پانچ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد مولانا نے ایک دوسرا پرچہ البلاغ شائع کیا۔ حکومت نے اس وقت اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اس شخص کو بار بار ضمانت ضبط کر کے دھمکایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے انہیں اپریل ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا سے نظر بندی اٹھالی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان کے سیاسی افق پر گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور حکیم اجمل خاں نمودار ہو رہے تھے۔ مولانا نے ان حضرات کے ساتھ مل کر تحریکِ خلافت میں کام کرنا شروع کیا۔

اس کتاب میں مولانا نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ کانگریس میں پٹیل ایک زبردست قوت کا مالک تھا اس نے بمبئی کے ایک مشہور پارسی لیڈر نریمان کی سیاسی زندگی برباد کی، بنگال کا مشہور رہنما سی آر داس بھی اسی شخص کی سازشوں کا شکار ہوا اور بھولا بھائی ڈیسائی کو بھی سیاسی طور پر ختم کرنے میں اس شخص نے نہایت شرمناک کھیل کھیلا۔ ڈیسائی کو جس طرح راستے سے ہٹایا گیا اس کی تفصیل سیاسی تاریخ میں ایک بڑی عبرتناک داستان ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی کی رہائی کے بعد لوگوں میں یہ احساس شدت سے ابھرنے لگا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت ہو جائے تو اس سے آزادی کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے اس گفت و شنید کے لیے لیاقت علی خاں مقرر ہوئے اور کانگریس نے یہ ذمہ داری مسٹر ڈیسائی پر ڈالی۔ اس وقت بجز گاندھی جی کانگریس کے سارے زعما جیل میں تھے۔ ڈیسائی نے گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہو کر اس گفت و شنید کے سارے نشیب و فراز سے انہیں آگاہ کیا۔ مسٹر گاندھی نے اس دن چونکہ خاموشی کا برت رکھا ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے زبانی جواب دینے کی بجائے لکھ کر کہا کہ ڈیسائی مصالحت کی اس کوشش کو جاری رکھیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر یہ کوشش ناکام رہی۔ ۱۹۴۵ء میں جب کانگریس کے رہنما رہا ہوئے تو اس کارروائی پر زبردست ہنگامہ ہوا اور اس ناکامی کی ساری ذمہ داری بڑی بے انصافی کے ساتھ ڈیسائی کے سر تھوپ دی گئی۔ اس مظلوم سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کارکن نے اس واقعہ سے جو شدید تاثر لیا اُس کو مولانا کے الفاظ میں ہی سنیے:

"اس واقعہ سے مسٹر ڈیسائی کو شدید صدمہ پہنچا اور ان کی صحت تباہ ہو گئی۔ انہیں پہلے بھی دل کا عارضہ تھا لیکن اس حادثہ کے بعد مرض نے شدت اختیار کر لی۔ انہیں رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ انہوں نے کس اخلاص کے ساتھ کانگرس کی خدمت کی ہے لیکن انہیں اس کا صلہ کیا ملا ہے، صرف ذلت اور رسوائی۔ میں جس وقت بمبئی گیا تو حسب معمول انہیں کے ہاں ٹھہرا۔ اس وقت وہ صاحب فراش تھے۔ جب میں نے ان سے ان کی حالتِ زار معلوم کرنا چاہی تو انہیں یارائے ضبط نہ رہا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انہیں سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ گاندھی جی نے بھی جنہیں سب واقعات کا پوری طرح علم تھا انہیں معترضین اور مخالفین سے بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نے مسٹر ڈیسائی کو تسلی دینی چاہی لیکن بے سود"

مسٹر ڈیسائی کے دل پر جو گزری ہو گی اُس کا اندازہ ہر مخلص کارکن بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کارکن کے لیے اس سے زیادہ باعثِ اذیت اور کوئی چیز نہیں ہوتی کہ اس کے رفقاء اُسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں اور خصوصاً اُس کا رہنما اس پر اعتماد نہ کرے۔ اپنے ساتھیوں کی رفاقت اور اپنے لیڈر کا اعتماد ہی دراصل وہ دو زبردست سہارے ہیں جن کے بل پر وہ وقت کے جابروں اور قہاروں سے لڑ جاتا ہے۔ وہ مقصد کے حصول کی خاطر فاقہ کشی برداشت کر سکتا ہے، قید و بند کی صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی سے جھیل لیتا ہے اور اگر وقت آن پڑے تو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیتا ہے لیکن اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس کے ہم سفر اور اس کا قائد اس سے بدظن ہوں۔ اعتماد کا کھو جانا ہر مخلص کارکن کی روحانی اور اخلاقی موت ہوتی ہے۔

پھر اس عبرتناک داستان میں ہمیں ان گھٹیا ہتھکنڈوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کو کام میں لا کر طالع آزما ہر بڑے آدمی کو ورغلانے اور اپنے ساتھیوں سے بدظن کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سردار پٹیل نے تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی بڑی افسوسناک داستان ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"ایک چیز جو گاندھی جی کے ذہن کو ہمیشہ مضطرب اور پریشان کرتی وہ سردار پٹیل کا رویہ تھا۔ یہ شخص گاندھی جی کے نہایت قریبی حلقے کا آدمی تھا اور وہ اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سردار پٹیل اپنی سیاسی زندگی کے وجود کے لیے ہی گاندھی جی کا دست نگر ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ کانگرس کے لیڈروں میں بعض ایسے بھی تھے جو گاندھی جی سے پہلے سیاسی میدان میں اتر چکے تھے۔ سردار پٹیل عدم تعاون کی تحریک سے پیشتر گجرات میں ایک معمولی وکیل تھا۔ جب گاندھی جی نے احمد آباد میں سکونت اختیار کی تو ان کی نگاہِ التفات سردار پٹیل پر پڑی۔ اور اس کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اس شخص کی سیاسی حیثیت کو مضبوط اور مستحکم کرنا شروع کیا۔ پٹیل گاندھی جی کا جاں نثار فدائی بن گیا اور ہمیشہ اپنی رائے ان ہی کے اشاروں سے بناتا۔ گاندھی جی نے اسے مجلس عاملہ کا رکن بنوایا اور ان کی خواہش پر ہی وہ ۱۹۳۱ء میں کانگرس کا صدر چنا گیا۔

تقسیم کے بعد پٹیل نے مسلمانوں کے معاملے میں ایک ایسا طرز عمل اختیار کیا جس سے گاندھی جی کو سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے مرن برت کا فیصلہ کیا۔ برت کے پہلے روز میں، سردار پٹیل اور پنڈت نہرو تینوں ان کے پاس عصر کے وقت گئے۔ باتوں باتوں میں پٹیل نے کہا کہ گاندھی جی اپنے رویہ سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے قتل و غارت کا ذمہ دار براہِ راست میں ہوں۔ اُس کے الفاظ سے کہیں زیادہ اس کے لب و لہجہ پر مجھے دکھ ہوا اور ہم نے اس معاملہ میں اسے کچھ مزید کہنا بالکل بیکار خیال کیا۔"

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک واضح تاثر جو انسان کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کانگرس میں اصلی مرضی صرف گاندھی جی کی چلتی تھی۔ مولانا نے اس حقیقت کا بڑے واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ لیکن گاندھی جی کی رائے بنانے اور تبدیل کرنے میں سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ دخل سردار پٹیل کو حاصل تھا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جب اُس نے تقسیم ملک کو قبول کر لیا تو اس کے بعد سارے لوگوں کو اسے تسلیم کرنا پڑا اور یہ سب قریب قریب وہی دلائل دیتے تھے جو سردار پٹیل نے اس موقع پر پیش کیے۔ پٹیل یہ کہتا کہ ہم خواہ اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر ہندوستان میں دو قومیں ہی آباد ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاع کو ختم کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔

مولانا نے کانگرس کی عدمِ تشدد کی پالیسی پر بھی چوٹ کی ہے اور کہا ہے کہ عدمِ تشدد کے حامی اب تقریباً دو کروڑ روپیہ سالانہ فوج پر خرچ کر رہے ہیں۔

اس کتاب میں بعض باتیں ایسی ہیں جو ایک قاری کو سخت الجھن میں ڈالتی ہیں۔ ہمایوں کبیر صاحب جو اس کتاب کے مرتب ہیں وہ کتاب کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ مولانا نے اس کتاب کا ایک ایک فقرہ پڑھا ہے اور اسے ان کی تصویب و توثیق حاصل ہے لیکن اس میں بعض ایسی نمایاں غلطیاں ہیں جنہیں دیکھ کر کبیر صاحب کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً کتاب کے پہلے صفحہ پر ہی مرتب لکھتے ہیں کہ مولانا کی والدہ محترمہ حضرت شیخ احمد ظاہر وتری کی بیٹی تھیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ تذکرہ میں مولانا نے صاف فرمایا ہے کہ اُن کی والدہ محترمہ حضرت شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی تھیں۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو اس کتاب کے بارے میں بہت سے شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے۔ اگر مولانا نے اس کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھا ہوتا تو اس نوعیت کی غلطی نہ ہوتی۔

پھر اس کتاب میں ہمیں بہت سی چیزیں ایسی بھی ملتی ہیں جن سے ہمیں اتفاق نہیں ہو سکتا مثلاً یہ دعویٰ کہ سنہ ۱۹۳۵ء کے بعد جب کانگرس برسرِ اقتدار آئی تو کسی مسلمان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں کی گئی بہت حد تک محلِ نظر ہے۔ ظلم و زیادتی کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک صورت وہ ہے جب کہ ایک قوم کے قومی وجود کو ہی مٹا دینے کا عزم کر لیا جائے۔ دین کے ساتھ اس قوم کا جو رشتہ ہے وہ مولانا سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوشیدہ نہیں۔ بندے ماترم اور واردھا کی تعلیمی اسکیم کے ذریعہ جس طریق سے مسلمانوں کے اجتماعی تخیلات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی اُسے اگر ظلم نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

یوں تو اختلاف کے بہت سے گوشے ہیں لیکن کتاب کے بالکل آخر میں یہ چند فقرے پڑھ کر دل کو شدید صدمہ ہوا۔ تقسیم ملک کے کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں

"مسٹر جناح اور ان کے ماننے والوں کو اس حقیقت کا احساس نہ ہوا کہ جغرافیہ اُن کا ساتھ نہیں دے رہا۔ ہندوستان میں مسلمان اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ وہ ایک خطہ میں اپنی الگ ریاست قائم نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی اکثریت یا تو شمال مغرب میں آباد ہے یا شمال مشرق میں ان دونوں خطوں کے درمیان کوئی ارضی تعلق نہیں۔ ان دونوں جگہوں کے رہنے والے سوائے مذہب کے ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس سے بڑا فریب اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ خطے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور تمدنی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں انہیں مذہب کا رشتۂ اتحاد ایک دوسرے سے مربوط کر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ماضی میں اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حد بندیوں سے ماورا تھا، لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلے چند سالوں میں زیادہ سے زیادہ پہلی ایک صدی کے بعد اسلام صرف اپنی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر مسلمانوں کے مختلف ممالک کو ایک ریاست بنانے میں ناکام رہا۔"

سچی بات یہ ہے کہ طبیعت یہ باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اسلام کے بارے میں اس حد تک بے اعتمادی اور بے یقینی اُس شخص کے اندر بھی پیدا ہو سکتی ہے جو کسی زمانہ میں اس سرزمین میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ یہ اندازِ فکر مرتب کا اپنا دکھائی دیتا ہے اور اس قسم کے احساسات کا اظہار وہ مختلف موقعوں پر کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتاب میں بعض ایسی فاش غلطیاں ہیں جنہیں دیکھ کر یہ بات کسی قدر وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا مرحوم کو اس کتاب کے مسوّدہ پر نظرِ ثانی کا اچھی طرح موقع نہیں ملا۔ کاش مولانا خود اپنے قلم سے اپنی سرگزشت رقم فرماتے۔ کسی دوسرے شخص کو اپنے خیالات و احساسات کا ترجمان بنانا بالکل مردہ بدستِ زندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا کی زندگی کے بہت سے دوسرے حادثات کی طرح یہ بھی ایک حادثہ ہے کہ وہ شخص جس نے نصف صدی سے کچھ اوپر نثر کے میدان میں بڑی فراوانی کے ساتھ گوہر لٹائے۔ جس نے اردو ادب کے سبزہ زاروں میں حسنِ تخیل، لطافتِ بیان اور جذبات و احساسات کے پھول کھلائے وہ آج اپنی حکایت بیان کرنے کے لیے کسی دوسرے کے قلم کا محتاج ہے۔

کتاب ہندوستان میں اورینٹ لانگ مین (دہلی) نے شائع کی ہے اور قیمت ساڑھے بارہ روپے ہے، پاکستان میں یہ کتاب غالباً فروخت کے لیے نہیں آئی۔

ضروری اعلان

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن کے ایجنٹوں کی خدمت میں درخواست ہے کہ اگر اُن کے پاس ماہ جنوری سنہ ۶۰ء کے پرچے بچے ہوئے ہوں تو دفتر ترجمان القرآن کو بھیج دیں۔ اُسی کمیشن پر واپس لے لیے جائیں گے جس پر بھیجے گئے تھے۔ پرچے بھیجنے سے قبل دفتر کو اطلاع دینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ماہ رجب ۷۵ھ کے ترجمان القرآن کے پرچے بھی بچے ہوئے ہوں تو وہ بھی ارسال کر دیں۔

(۲) خریدار صاحبان کو اپنا پتہ تبدیل کرانے کے لیے سابقہ پتہ ضرور لکھنا چاہیے۔ اسی طرح منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن پر اپنا نمبر خریداری اور پتہ صاف تحریر فرمائیں۔ ورنہ عدمِ تعمیل کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔ نئے خریدار صاحبان بھی اپنا مکمل پتہ خوشخط اور صاف لکھ کر بھیجا کریں۔ اور ساتھ ہی جس ماہ سے پرچہ جاری کرانا ہو اس کا نام لکھ دیا کریں۔

چراغ الدین منیجر ترجمان القرآن

© rasailojaraid.com